سوال نمبر2(الف) (i)

جواب: بزرگ کے کمرے اور سیڑھی کے درمیان تقریباً دس گز کا فاصلہ تھا۔ بزرگ کے لیے یہ دس گز کا چھوٹا سا فاصلہ ایک بڑی آزمائش بن جاتا تھا۔

سوال نمبر2(الف) (ii)

جواب: جب بزرگ اپنے کمرے کا دروازہ بند دیکھتا تھا تو اسے اس لیے اطمینان ہوتا تھا کہ اس کے پوتے اور پوتی کمرے میں نہیں گئے اور کمرہ صاف ستھرا ہوگا۔

سوال نمبر2(الف) (iii)

جواب: جب دروازے کے دونوں پٹ کھلے ہوتے تھے تو اسے پریشانی کا سامنا کرنا پڑتا کیوں کہ اس کے پوتی اور پوتے کمرے میں جاکر اس کمرے کا حال خراب کر دیتے تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ جب دروازے کے باہر کمرے کی کوئی چیز ہوتی تب بھی وہ پریشان ہو جاتا تھا۔

سوال نمبر 2(الف) (iv)

جواب: مصنف نے کہا "اس کی پیشانی شکن آلود ہو جاتی تھی" یعنی بزرگ کے ماتھے پر غصے کی وجہ سے لکیریں بن جاتی تھیں۔ ایسا تب ہوتا جب اس کے پوتے پوتیوں نے کمرے میں اودھم مچا رکھا ہوتا تھا۔

سوال نمبر 2(الف) (v)

جواب: اس مرتبہ بچوں نے معمول سے زیادہ تباہی مچائی تھی۔ انہوں نے پلنگ کی چادر جس کو بزرگ کی بہو نے حال ہی میں تبدیل کیا تھا اس پر کوئی میٹھی چیز کھائی تھی اور اس کے ساتھ گرائی بھی تھی جس کی وجہ سے مکھیاں آ گئی تھیں۔

سوال نمبر 2(الف) (vi)

جواب: مکھیاں پلنگ کی چادر پر بھنبھنا رہی تھیں کیوں کہ اس کے پوتے اور پوتیوں نے اس پر بیٹھ کر میٹھا کھانے کے ساتھ گرایا بھی تھا۔ چناں اس کی وجہ سے وہاں پر مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں۔

سوال نمبر2(الف)(vii)

جواب: دروازے کھلا پڑا اس بات کی گواہی دیتے تھے کہ بزرگ کے پوتے اور پوتیوں نے اس کے کمرے میں تباہی مچا رکھی ہوتی تھی۔ یعنی اس کے پوتے پوتی کمرے کے اندر تھے۔

سوال نمبر2(الف)(viii) خلاصہ:-

بزرگ کے کمرے اور آخری سیڑھی میں بہت فاصلہ تھا۔ جب بزرگ کے کمرے کا دروازہ بند ہوتا تو وہ اطمینان میں ہوتا مگر جب دروازہ کھلا ہوتا تو اسے پریشانی کا سامنا ہوتا کیوں کہ اس کے پوتے اور پوتی کمرہ خراب کر دیا کرتے تھے۔ اس دن دروازہ بھی کھلا تھا جب وہ اندر گیا تو اسے غصہ آیا کیوں کہ اس کے پوتے اور پوتیوں نے کمرے میں تباہی مچا رکھی تھی خصوصاً پلنگ کی چادر پر۔

سوال نمبر 2(ب) (i)

جواب: پہلے شعر میں شاعر نے کہا کہ اللہ تعالیٰ ہر جگہ موجود ہے خواہ وہ کوئی محفل ہو یا کوئی تنہائی والی جگہ۔ اللہ کا کوئی مادی وجود تو نہیں ہے مگر ہم اسے اس کی نشانیوں کے ذریعے سے دیکھ سکتے ہیں۔

سوال نمبر 2(ب) (ii)

جواب: شاعر کے نزدیک غبارِ راہ طیبہ بصیرت کا سرمایہ اور شفاء ہے۔ یعنی مدینے کی خاک اہل ایمان کے لیے بصیرت کا سرمایہ اور اللہ کے حکم سے شفاء ہے۔

سوال نمبر 2(ب) (iii)

جواب: شاعر نے عشق کو گستاخی کہتے ہوئے کہا ہے کہ عشق خود تجھے سب کچھ سکھا دے گا چاہے وہ حیا ہو یا شرارت۔ عشق کو گستاخی اس لیے کہا کیوں کہ یہ انسان کو معمول سے ہٹا دیتی ہے اور انسان میں جھجک اور پردہ باقی نہیں رہتا۔

سوال نمبر 2(ب) (iv)

جواب: شاعر حال دل لکھنے پر اس لیے قادر ہے کیوں کہ جو بات شاعر کے دل سے گزرتی ہے وہ چاہتا ہے کہ اُس بات کو قلم بند کرے یعنی وہ اپنے یار کو اپنے دل کا حال بیان کرنا چاہتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ اپنے دل کے حال یعنی اپنی اپنے دل پر گزرنے والی ہر بات کو یار کو سنائے۔ وہ ایسا اس لیے کرتا ہے کیوں کہ اس کا ہاتھ دل سے جدا نہیں ہوتا یعنی دل کی بات خود بخود لکھنے کا جی چاہتا ہے اور وہ اپنے اوپر بوجھ کو ہلکا کرنا چاہتا ہے۔

سوال نمبر 2(ب) (v)

مرکزی خیال:-

موجودہ مسلمان اپنے اسلاف سے مختلف ہے۔ موجودہ مسلمان باتوں کا غازی جب کہ وہ عمل کرنے والے تھے۔

سوال نمبر 2(ج) (i)

کنایہ:-

"کنایہ کے لفظی معنی چھپا ہوا، پوشیدہ یا مبہم بات کرنا کے ہیں۔ جب کو لفظ حقیقی کی بجائے مجازی معنوں میں استعمال ہو اور اس کے حقیقی معنی بھی مراد لیے جا سکیں تو اسے کنایہ نہیں کہتے ہیں۔

مثال:-

e میر کیا سادہ ہیں بیمار ہوئے جس کے سبب
اسی عطار کے لونڈے سے دوا لیتے ہیں

سوال نمبر 2(ج) (ii)

یہ ایک جملہ **فعلیہ** ہے۔ جملہ فعلیہ کے مسند الیہ کو فاعل اور مسند کو فعل کہتے ہیں۔

سلیم ← مسند الیہ ← فاعل

کتاب ← مفعول

پڑھ ← مسند ← فعل

رہا ہے ← فعل ناقص

سوال نمبر 2(ج) (iii)

مجاز مرسل :-

جب کوئی لفظ حقیقی کی بجائے مجازی معنوں میں استعمال ہو اور اس کے حقیقی اور مجازی معنوں میں تشبیہ کے علاوہ کوئی اور تعلق ہو تو اسے مجازِ مرسل کہتے ہیں۔

مثلاً :-

e یعنی کس منہ سے جاؤ گے غالبؔ
شرم تم کو مگر نہیں آتی۔

اس کے علاوہ ۔ "اکرم نے بوتل پی"۔

سوال نمبر 2(ج) (iv)

ذو معنی الفاظ :-

وہ لفظ جو دو یا دو سے زیادہ معنوں میں استعمال ہوں اسے ذو معنی الفاظ کہتے ہیں مثلاً :-

کان : جسم کا حصہ
کان : قیمتی چیز کا ذخیرہ

1) میرے کان میں درد ہے۔
2) سونے کی کان میں حادثہ ہو گیا۔

سوال نمبر 3 (صفحہ نمبر 1)

حوالہ متن:-

مصنف کا نام: غلام الثقلین نقوی

سبق کا نام: میرا گاؤں

سیاق و سباق:-

تشریح طلب پیراگراف ہماری اردو کی کتاب کے سبق "میرا گاؤں" سے لیا گیا ہے جس کے مصنف غلام الثقلین نقوی ہیں۔ اس سبق میں ایک گاؤں کا منظر بیان کیا گیا ہے جہاں پہلی مرتبہ آٹا پیسنے کی مشین لگی تھی۔ گاؤں کے بچو پدی کا بیٹا سُکی (سلیمان) اور ماہینا ایک دوسرے کے ہم عمر تھے اور ساتھ پڑھتے تھے۔ سُکی ماہینے سے اپنا کام کرواتا تھا۔ جس دن آٹا پیسنے کی مشین لگنی تھی اس دن گاؤں میں ڈھول کی آوازیں تھی اور سب کوئی خوش تھا سوائے بابا نتھو کے جس کو یہ شیطانی چرخہ لگتا تھا۔

تشریح:-

مختصر تشریح طلب پیراگراف ہماری اردو کی کتاب کے سبق میرا گاؤں سے لیا گیا ہے جس کے مصنف غلام الثقلین نقوی ہیں۔ اس پیراگراف میں ماہینے اور ایک بچھیا "گودی" کے رشتے پر زور دیا گیا ہے۔ ماہینا ایک کسان کا بیٹا ہے جہاں چرانے مال مویشی سے لگاؤ تھا۔ یہ ایک حقیقت ہے انسان جس جگہ میں پرورش پاتا ہے جس ماحول میں اس کی تربیت کی جاتی ہے وہ اس ماحول سے پیار کرتا ہے۔ اگر کوئی شخص امیر ہے تو اس کی تربیت بڑے گھرانے اور

محلے میں ہوگی۔ چناں چہ وہ شخص اس ماحول کو پسند کرے گا جہاں وہ پروان چڑھا۔ ماہیا کسان کا بیٹا تھا اس لیے مال مویشی سے بچپن سے ہی لگاؤ رکھتا تھا۔ اس کے بعد بھیا کے بارے میں بتایا کہ وہ کتنی خوبصورت تھی۔ ہمارے رب تعالیٰ نے جس چیز کو بھی بنایا ہے بڑی شان سے بنایا ہے۔ اس میں کوئی کمی نہیں آنے دی۔ اس سے ایک شعر ذہن میں آتا ہے۔ بقول شاعر:

کھول آنکھ زمین دیکھ فلک دیکھ فضا دیکھ
مشرق سے ابھرتے ہوئے سورج کو ذرا دیکھ

چناں چہ اللہ کی بنائی ہر چیز شاندار ہے۔ بھیا کے بارے میں کہاں گیا کہ وہ کدکارے لگاتی تھی۔ جب کوئی جاندار چھوٹا ہوتا ہے خواہ وہ جانور ہو یا انسان وہ بہت زیادہ چست اور عقل مند ہوتے ہیں۔ اس طرح بھیا کے بارے میں بتایا کہ وہ بھی ایک چھوٹے بچے کی طرح اِدھر اُدھر جاتی اور کدکارے لگاتی تھی۔ ماہیا اس سے بہت پیار کرتا تھا اور اس نے گوری کو کافی عرصہ پہلے دیکھا تھا۔ چناں چہ ماہیے کے دل میں گوری کو دیکھنے کی لالچ بڑھ گئی اور وہ انکار نہ کر سکا۔ یہ ایک معمولی بات ہے کسان کے لیے۔ وہ اپنے مال مویشی کو اپنی اولاد سے کم نہیں سمجھتے اور ان کو اتنا ہی پیار کرتے ہیں جتنا اپنی اولاد کا کرتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ کسان اپنا نصف وقت مال مویشی کے ساتھ گزارتا ہے اور اس کے دل میں اس کی لگن بہت ہوتی ہے آخر میں ہوتوں کا منظر بتایا گیا کہ وہ سب اپنے سروں پر گٹھڑیاں لادے ہیں سوائے چودھرائن کے

سوال نمبر 4 (صفحہ نمبر 1)

حوالہ متن:-

نظم کا نام: خطاب با جوانان اسلام

شاعر کا نام: علامہ اقبال

مفہوم:-

تم اس عظیم قوم کی اولاد ہو جس نے محبت سے تمہاری پرورش کی اور بہادری سے ایرانی سلطنت کو شکست دی۔ وہ عرب کے سادہ اور اونٹ پالنے والے ایمان و عمل کی بدولت مستقبل کے معمار بنے۔ وہ غریبی میں بھی اللہ کے سوا کسی اور سے نہ مانگتے اور امیر بھی ان کو دیکھ کے ڈرتا تھا۔

تشریح:-

اس بند میں شاعر علامہ اقبال نے ماضی کے مومن کی عظمت بیان کرتے ہوئے کہا ہے کہ ماضی کے مومن انتہائی دلیر اور بہادر تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ بڑے شفیق بھی تھے۔ انہوں نے تمہاری تربیت محبت سے کی۔ شاعر کہتا ہے کہ وہ اتنے بہادر تھے کہ انہوں نے ایرانی سلطنت جو اس وقت کی عظیم ترین سلطنت میں شمار ہوتی تھی اس کو انہوں نے شکست دی۔ وہ ظالم اور سختی کرنے والے نہ تھے بلکہ وہ تو اپنے بچوں پر شفقت کرتے جیسا ان کے رسول ﷺ نے انہیں بتایا تھا۔

بقول شاعر:-

نگاہ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں
جو ہو ذوقِ یقیں پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں

اس شعر کے مطابق اگر انسان کچھ کرنے کا سوچ لے تو وہ اسے ضرور

سوال نمبر 4 (صفحہ نمبر 2)

پورا کرتا ہے۔ دوسرے شعر میں شاعر نے ماضی کے مومن مستقبل کے بارے میں بیان کیا ہے۔ شاعر بتاتا ہے کہ وہ پہلے شتربان یعنی اونٹ پالنے والے تھے۔ ان کو کسی بھی بات کا علم نہ تھا۔ انہوں نے کسی قسم کی تعلیم بھی حاصل نہ کی تھی۔ مگر اسلام کی بدولت وہ دنیا کے فاتح بن گئے۔ ایسا صرف اس لیے ہوا کیوں کہ انہوں نے اللہ پر توکل کیا اور محنت کو جاری رکھا۔ وہ کبھی بھی پیچھے نہ ہٹے۔ اگر انسان محنت کرے تو دنیا میں کوئی ایسی چیز نہیں جو ناممکن ہو۔ بقول شاعر:

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری

اس سے مراد یہ ہے کہ انسان اپنا مستقبل خود لکھتا ہے۔ پندرھ آخری شعر میں شاعر نے ماضی کے مومن کی عظمت بیان کی اور کہا کہ وہ غریبی میں بھی صرف اللہ سے مانگتے تھے۔ جب کہ اگر کوئی معمولی شخص ہوتا تو وہ لوگوں کے دروازے پر مانگتا لیکن ماضی کا مومن عزت مند تھا۔ وہ اتنا عزت مند تھا کہ امیر بھی ان کو صدقہ دینے سے ڈرتے کہ کہیں وہ اسے اپنی توہین نہ سمجھ لے۔ بقول شاعر:

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

اس شعر میں خودی کو تھامے رکھنے کا حکم دیا گیا ہے۔ ماضی کا مومن بڑا عظیم، طاقت ور، عزت مند اور شفیق تھا جب کہ موجودہ مسلمان میں ان میں سے ایک صفت بھی نہیں ہے

سوال نمبر 5 (صفحہ نمبر 1)

حوالہ متن:-

شاعر کا نام: مرزا غالب

مفہوم:-

شاعر ایمان و کفر کے درمیان الجھا ہے: وہ کعبہ اور کلیسا کے درمیان کھڑا ہے۔
چاہے انسان جسمانی طور پر کمزور ہو جائے
مگر زندگی کا شوق باقی رہتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ دنیا کے جام و لذت اس کے سامنے رہیں۔

تشریح:-

شعر 1:-

پہلے شعر میں شاعر کہتا ہے کہ وہ کعبہ اور کلیسا کے درمیان کھڑا ہے۔ شاعر ایک کشمکش میں ہے۔ اسے نہیں معلوم کون سا راستہ درست ہے۔ وہ ایمان و کفر کے درمیان الجھا ہے شاعر کو نہیں معلوم کہ کون سا راستہ اچھا درست ہے۔ شاعر دنیا کو بھی نہیں چھوڑنا چاہتا مگر وہ اخروی کامیابی بھی چاہتا ہے انسان کو زندگی میں آخرت کی تیاری کرنی چاہیے۔ یہ دنیا آخرت کی تیاری کے لیے بنائی گئی ہے۔ جنت کا راستہ آسان نہیں ہے مگر جنت ایک بہت خوبصورت جگہ ہے۔ اس کے برعکس جہنم کا راستہ تو بہت آسان ہے مگر اس میں جانا کوئی نہیں چاہتا ہے۔ بقول شاعر۔

؎ عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری

سوال نمبر 5 (صفحہ نمبر 2)

اس شعر میں ہمیں شاعر کی کشمکش کا جواب ملتا ہے جو عمل کرنا ہے۔

شعر 2 :-

دوسرے شعر میں شاعر بیان کرتا ہے کہ انسان چاہے جسمانی طور پر کمزور ہی کیوں نہ ہو جائے مگر زندگی کا شوق باقی رہتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ دنیا کے جام و لذت اس کے سامنے رہیں۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جو انسان دنیا کو اپنی حقیقت سمجھ لیتا ہے وہ ہمیشہ یہیں کا رہ جاتا ہے۔ اس کا دل نہیں کرتا کہ یہ سب ختم ہو۔ چناں چہ ایسا شخص اپنی آخرت کو بھلا دیتا ہے اور دنیا کو ہی سب کچھ بنا لیتا ہے۔ بقول شاعر :-

ع میر کیا سادہ ہیں بیمار ہوئے جس کے سبب
اس عطار کے لونڈے سے دوا لیتے ہیں

اس شعر سے اس بات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ انسان ایک چیز کو جانتے کہ وہ اس کے لیے بری ہے مگر پھر بھی وہ اس میں مبتلا رہے تو یہ بالکل غلط ہے۔ انسان کو چاہیے کہ وہ اپنی آخرت کی تیاری کرے۔ دنیا کی دوڑ میں بھاگنے سے افسوس کے علاوہ کچھ نہیں حاصل ہوتا۔ چناں چہ انسان کو اپنی آخرت کی فکر کرنی چاہیے۔ یہی وجہ ہے کہ آخرت کو دنیا کی کھیتی کہا گیا ہے۔ انسان کو چاہیے کہ وہ اللہ کی یاد میں زندگی وقف کرے نہ کہ اس دنیا کی لالچ میں اپنا وقت برباد کرے۔

سوال نمبر 6 (صفحہ نمبر 1)

امتحانی مرکز
9-اپریل 2026ء

پیارے چچا جان!

السلام علیکم۔

اُمید ہے کہ آپ خیریت سے ہوں گے۔ میں بھی خیریت سے ہوں۔ جیسا کہ آپ کو معلوم ہے کہ کچھ دن کے بعد عید الاضحیٰ کی رونق ہر طرف چھا جائے گی۔ اگر آپ بھی یہ عید ہمارے ساتھ منائیں گے تو ہماری خوشی اور بھی زیادہ ہو جائے گی۔

آپ کو ہمارے گھر آئے ہوئے کافی عرصہ گزر گیا۔ چناں چہ میں چاہتا ہوں کہ آپ یہ عید ہمارے ساتھ گزاریں۔ آپ کے یہاں ہونے سے ماحول بہت خوش گوار ہو جاتا ہے۔ سب آپ کی مزاحیہ باتوں کو بہت پسند کرتے ہیں۔ اس کے ساتھ بابا جان نے اس مرتبہ بیل کی قربانی کا سوچا ہے چناں چہ آپ بھی اس میں حصہ ڈال سکتے ہیں۔ اس طرح آپ کی کچھ پریشانی بھی آسان ہو جائے گی۔ اس کے ساتھ ساتھ میرے بابا کچھ دنوں سے مایوس ہیں۔ اگر آپ آجائیں گے تو بابا جان بھی بہت خوش ہوں گے۔

آپ مجھے خط کا جواب ضرور دیجیے گا تاکہ میں خود آپ کو لینے کے لیے آسکوں۔ جب بھی آپ ہمارے ساتھ ہوتے ہیں تو گویا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ

سوال نمبر 6 (صفحہ نمبر 2)

دنیا میں کوئی پریشان کرنے والی بات ہے ہی نہیں۔ آپ یہ عید ہمارے ساتھ ضرور منانے تشریف لائیے گا۔ میری طرف سے چچی جان کو سلام اور ننھے شہزادوں کو پیار۔

والسلام
آپکا بھتیجا
الف۔ب۔ج

سوال نمبر 7 (صفحہ نمبر 1)

مضمون نویسی :-

"گداگری ایک لعنت"

گداگری کے معنی لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلانا اور ان سے مانگنا۔ یہ ایک منفی عمل ہے مگر موجودہ دور میں اس نے ایک پیشے کی شکل اختیار کر لی ہے۔ لوگ محنت نہیں کرتے اور لوگوں کے دروازے پر جا کر ان سے مانگتے ہیں۔

گداگری کے نقصان

ہیں جن میں سب سے بڑا محنت کا خاتمہ ہے۔ جو لوگ دوسروں سے مانگتے ہیں وہ محنت نہیں کرتے۔ ان کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ پیسا حاصل کرنے کا بڑا آسان طریقہ ہے جبکہ یہ انسان کی محنت کا سب سے بڑا دشمن ہے۔ انسان کو چاہیے کہ وہ گداگری کے بجائے محنت مزدوری کرے اور حلال رزق کمائے۔

بقول شاعر:-

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری

اس شعر سے یہ واضح ہوتا ہے کہ انسان کی کامیابی کا انحصار اس کی محنت پر ہے۔

گداگری میں اضافے کی سب سے بڑی وجہ انسان میں خودی ختم ہونا ہے۔ جب انسان کے اندر غیرت مر جاتی

سوال نمبر 7 (صفحہ نمبر 2)

ہے جو وہ گداگری کو اپنا معمول بنا دیتا ہے۔ اس کے برعکس ایک غیرت مند شخص ہمیشہ محنت سے حلال روزی کماتا ہے اور معاشرے میں ترقی کرتا ہے۔ بقول شاعر:

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

یہ شعر ہمیں خودی کو بیدار اور اس پر قائم و دائم رہنے کا حکم دیتا ہے۔

گداگری کا ایک اور منفی پہلو یہ ہے کہ وہ شخص جو دوسروں سے مانگتا ہے اسے اللہ پر توکل نہیں ہوتا۔ وہ سمجھتا ہے کہ صرف لوگ ہی اسے رزق دے سکتے ہیں۔ گداگری سے انسان اللہ پر توکل چھوڑ دیتا ہے۔ اس کے برعکس ایک محنت پسند شخص ہمیشہ خون پسینا ایک کرتا ہے اور اللہ کی ذات پر توکل کرتا ہے بقول شاعر:

توکل کا یہ مطلب ہے کہ خنجر تیز رکھو اپنا
پھر انجام اس کی تیزی کا مقدر کے حوالے کر

اگر ہم اپنے ماضی پر ایک نظر دوڑاتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ ماضی کا مسلمان کتنا غیرت مند، جرات مند اور توکل کرنے والا تھا۔ وہ غریبی میں بھی اللہ کے سوا کسی اور سے نہ مانگتے تھے۔ انہوں نے اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھامے رکھا اور محنت کبھی نہ چھوڑی۔ جبکہ موجودہ دور اس کا بالکل الٹ ہے۔ وہ نہ تو محنت کرتے ہیں اور نہ ہی

سوال نمبر 7 (صفحہ نمبر 3)

توکل کرتے ہیں۔ بقول شاعر:-

"گدائی میں بھی وہ اللہ والے تھے غیور اتنے
کہ منعم کو گدا کے ڈر سے بخشش کا نہ تھا یارا"

گداگری کو ختم کرنے کے لیے سب کو ایک ہونا ہوگا۔ لوگوں کو چاہیے کہ وہ ہر مانگنے والے شخص کو پیسے دینے سے گریز کریں۔ صرف ضرورت مند لوگوں کو صدقہ دیا جائے نہ کہ ان کو جو مانگنے آتے ہیں۔ ایک سچا ضرورت مند کبھی بھی کسی سے مانگتا نہیں ہے۔ ہمیں چاہیے کہ ہم ان دیکھے سب کو دینے سے گریز کریں۔

حکومت پاکستان کو چاہیے کہ وہ لوگوں کے لیے نوکریوں میں اضافہ کرے تاکہ گداگر بھی محنت کر کے اپنے بچوں کو حلال کا کھانا کھلا سکے۔ حکومت کو چاہیے کہ وہ ان گداگروں سے کام لے کر انہیں پیسے دیں تاکہ ان کا محنت کرنے کو دل کرے۔ حضرت علی کا قول ہے:-

"محنت سے روزی کمانے والا اللہ کا دوست ہے" چنانچہ حکومت کو چاہیے کہ وہ انہیں محنت کرنے کا موقع دے۔

اختتام میں گداگری ایک ایسی لعنت ہے جس سے تقریباً ہر غریب متاثر ہے۔ ہم سب کو مل کر چاہیے کہ گداگری کو ختم کرنے کے لیے اپنی پوری جان لگائیں تاکہ معاشرہ ترقی کرے اور اللہ اور اس کے رسول ہم سے راضی ہو سکیں۔